بحث ونظر

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اہم فقہی نظریات کا ایک ناقدانہ جائزہ

مولانا اختر امام عادل

فقہ کا رشتہ اس کے اصل سرچشموں سے:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس پر زور دیا ہے کہ فقہ وفتاویٰ کو صرف چند کتابوں تک محدود کرنے کے بجائے اس کو اصل سرچشموں سے مربوط کیا جائے، اور عمومیت کے ساتھ یہ واضح کیا جائے کہ یہ علم قرآن وحدیث سے کس طرح اخذ کیا گیا؟ حجۃ اللہ البالغہ میں انہوں نے مستقل ایک مبحث قائم کیا ہے:

"مبحث استنباط الشرائع من حديث النبي صلى الله عليه وسلم" یعنی احادیث سے مسائلِ شرعیہ کے استنباط کا طریقہ کیا ہے؟ اس مبحث کے تحت ایک باب قائم کیا ہے: "باب كيفية تلقى الأمة الشرع من النبي صلى الله عليه وسلم" یعنی امت نے اپنے نبی ﷺ سے علوم شرعیہ کی تحصیل کیسے کی؟ اس باب کے تحت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علومِ شرعیہ کے حصول کے دو طریقے تھے:

۱۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ الفاظ وواقعات کے ظواہر کو محفوظ کیا گیا اور اس کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا گیا، پھر اس کی کئی صورتیں ہیں: متواتر، مشہور اور خبر واحد وغیرہ جس کے لئے محدثین نے باقاعدہ اصول مقرر کئے۔

۲۔ دوسرا طریقہ معنوی تحصیل یا اجتہاد واستنباط کا ہے، صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی عمل کرتے ہوئے یا کوئی قول ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا تو دلائل، قرائن سے یہ استنباط کیا کہ یہ چیز واجب ہے، جائز ہے، یا مستحب ہے۔ پھر یہ مسائل صحابہ سے تابعین تک اور ان سے تبع تابعین تک منتقل ہوئے۔ صحابہ کی اکثریت اس قوتِ اجتہاد واستنباط کی حامل تھی، مگر ان میں

چار صحابہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کو خاص امتیاز حاصل تھا، ان میں بھی حضرت عمر سب سے ممتاز تھے، شاہ صاحب کے خیال میں امت کے تمام مجتہدین کے مذاہب فقہیہ، فقہ فاروقی کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتے ہیں، جو ایک شرح کی متن کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ (حضرت شاہ صاحب نے ''فقہ فاروقی'' کو باقاعدہ ایک رسالہ کی شکل میں مدون کیا ہے، یہ اس باب میں پہلا مبارک اقدام تھا جس کو شاہ صاحب نے دوسری اوّلیات کے ساتھ انجام دیا)۔(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل میں اجتماعی طور پر غور وخوض فرماتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت فاروق اعظم کے فتاویٰ پوری مملکت اسلامیہ کے طول وعرض میں باتفاق رائے قبول کئے گئے، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے کہ حضرت عمر فاروق کی وفات سے علم کے دس حصوں میں سے نو حصے رخصت ہو گئے۔ حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ حضرت عمر جو راہِ عمل انتخاب فرماتے وہ ہمیں سہل محسوس ہوتی تھی۔ دیگر صحابہ نے اپنے حالات اور مواقع کی بنا پر یہ طرز اختیار نہیں کیا، اس وجہ سے ان کے مسالک کی اشاعت محدود رہی۔

پھر تابعین نے یہ خدمت انجام دی، بالخصوص مدینہ میں فقہاء سبعہ، اور ان میں بھی حضرت سعید بن المسیب، مکہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعی، حضرت شریح اور حضرت شعبیؒ اور بصرہ میں حضرت حسن بصریؒ نے زیادہ نمایاں خدمات انجام دیں، اور اس طرح مسائل شرعیہ کا یہ علم طبقہ در طبقہ امت میں منتقل ہوتا رہا۔

دونوں طریقوں کا انضمام:

مگر حصول کے یہ دونوں طریقے جداگانہ حیثیت میں ناکافی ہیں اور ان میں غلطی کا بہت امکان ہے، اس لئے کہ طریقۂ اول میں کمزوری یہ ہے کہ روایت بالمعنی کی صورت میں الفاظ کی تبدیلی سے معنی بدل جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ کے حکم کو راوی نے حکم

۱۔ اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ حال میں (۱۴۰۱ھ م ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے ''موسوعۃ عمر بن الخطاب'' کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۶۸۷ صفحات پر آئی ہے

کلی سمجھ لیا ہو، نیز یہ بھی امکان ہے کہ کسی مصلحت سے کی جانے والی تاکید کو راوی وجوب یا حرمت سمجھ بیٹھا ہو، حالانکہ فی الواقع معاملہ ایسا نہ ہو، اس لئے ضروری ہے کہ راوی فقیہ اور صاحب اجتہاد ہو تاکہ معاملہ کو صحیح طور پر پرکھ سکے۔

دوسرے طریقے میں نقص یہ ہے کہ اس میں صحابہ کے قیاسات اور اجتہادات کا بڑا حصہ شامل ہے جس میں غلطی کا بہرحال امکان ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حدیث ہی نہیں ملی، یا ایسے طریق سے ملی کہ اس سے استدلال ممکن نہیں رہا اور اس بنیاد پر صحابی نے اجتہاد کو حکم کا مدار بنایا، اور اس کے بعد پھر کسی دوسرے صحابی سے صحیح اور واضح طور پر وہ روایت سامنے آ گئی، مثلاً جنابت کے باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسلک یہ نقل کیا جاتا ہے کہ تیمم کافی نہیں ہے، ان تک روایت صحیح طور پر نہیں پہنچی اور انہوں نے اجتہاد کو مدار بنایا، حالانکہ صحیح روایت موجود ہے۔

غرض دونوں طریقوں میں جداگانہ طور پر غلطی کے امکانات موجود ہیں۔ اس لئے فقہ و اجتہاد کے معاملے میں محفوظ اور معتدل راستہ یہ ہے کہ دونوں طریقوں سے ایک ساتھ استفادہ کیا جائے اور دونوں کی روشنی میں اجتہاد و استنباط کیا جائے، تاکہ ایک کی کمزوری کی تلافی دوسرے سے ہو سکے، یہ ایک راہِ اعتدال ہے جس کا شاہ صاحب نے فقہ و اجتہاد کے طلبہ اور علماء کو مشورہ دیا ہے۔(۱)

قرونِ اولیٰ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے:

اس ضمن میں مناسب ہے کہ ان دو مکاتب فقہ کا تذکرہ کیا جائے، جو اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کے نام سے معروف تھے، شاہ صاحب نے ''الانصاف'' میں اس پر بہت مفصل گفتگو کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ دونوں مکاتبِ فکر دراصل مذکورہ بالا دونوں طریقوں کی پیداوار ہیں، اہل الحدیث نے پہلے طریق کو اختیار کیا، اور اہل الرائے نے دوسرے طریقے کو۔

۱۔ ولما كان الامر كذلك وجب على الخائض في الفقه ان يكون متضلعاً من كلا المشربين ومستجواً في كلا المذهبين وكان احسن شعائر الملة ما اجمع عليه جمهور الرواة وحملة العلم وتطابق فيه الطريقتان جميعاً (حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۳۲، اشرفی بکڈپو دیوبند، ۱۳۷۳ھ طبع اول)

یہ حضرت سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ اور ان کے بعد امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کا دور ہے، یہ دونوں گروہ اسی دور میں وجود پذیر ہو گئے تھے۔

اہلِ حدیث کا طبقہ اجتہاد و استنباط اور قیاس و رائے کی بنیاد پر فتویٰ دینے سے حد درجہ گریز کرتا تھا اور مجبوری کے بغیر وہ قیاس نہیں کرتا تھا۔ ان کی زیادہ تر توجہ احادیث و آثار پر ہوتی تھی۔ اس لئے یہ حضرات مستقبل کی امکانی صورتوں کو (جس کو فقہ تقدیری کہا جاتا ہے) بھی زیر بحث لانا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان کے پیش نظر کئی ایسے آثار تھے جن میں امکانی صورتوں کا حکم بتانے سے گریز کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

یایھا الناس لا تعجلوا بالبلاء قبل نزولہ لا ینفک المسلمون ان یکون فیھم من اذا سئل سدد۔(۱)

حوادث کے آنے سے پہلے ان کے بارے میں اظہار خیال نہ کرو اسلئے کہ مسلمانوں میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جو ہر مشکل کا حل پیش کریں گے۔

حضرت عمر، حضرت علی، ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے۔

بعض ایسے آثار بھی موجود تھے، جن میں رائے کی بنیاد پر فتویٰ دینے سے احتیاط کی تاکید کی گئی تھی۔ مثلاً حضرت ابن عمر نے حضرت جابر بن زید سے فرمایا:

''اے جابر رضی اللہ عنہ تمہارا شمار فقہاء بصرہ میں ہوتا ہے، پس قرآنِ ناطق یا سنت معمولہ کے علاوہ کسی سے فتویٰ نہ دینا، ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور دوسرے کی ہلاکت کا بھی سامان کرو گے۔''(۲)

ابو النضر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سلمہ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصری ملاقات کے لئے حاضر ہوئے حضرت ابو سلمہ نے حضرت حسن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ ہی حسن بصری ہیں؟ میں بصرہ میں سب سے زیادہ آپ ہی سے ملنے کا مشتاق تھا، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ اپنی

۱۔ سنن دارمی، المقدمۃ، باب من ھاب الفتیا۔

۲۔ سنن دارمی، المقدمۃ، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ۔

☆ میں نے امام محمد سے بڑھ کر کوئی فصیح نہیں دیکھا (امام محمد بن ادریس شافعی) ☆

رائے پر فتویٰ دیتے ہیں، اپنی رائے پر ہرگز فتویٰ نہ دیں۔(۱)

ان آثار کی بنیاد پر اس طبقہ کی تمام تر توجہ احادیث و آثار کے جمع و تدوین کی طرف رہی، اس لئے کہ جس کے پاس احادیث و آثار کا جتنا بڑا ذخیرہ ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ تعلیم اور فتویٰ کے لائق مانا جاتا تھا۔

ایک ایک حدیث کے سو سو سے زائد طرق تھے، اس طرح جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا، جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، ایک ایک آدمی لاکھوں احادیث کا حافظ ہوتا تھا، امام بخاری کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی صحیح بخاری چھ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے۔ امام ابو داؤد کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے تیار کی، امام احمد نے اپنی مسند میں روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا کہ کہا جاتا ہے کہ جو روایت اس میں نہ ملے، وہ بے اصل ہے۔ خود امام احمد اپنی اس کتاب کو ''میزان'' کہتے تھے اور اسی بنیاد پر جب حضرت امام احمد سے پوچھا گیا کہ کیا فتویٰ دینے کے لئے ایک لاکھ احادیث کافی ہیں، انہوں نے فرمایا نہیں، سائل اسی طرح اپنے سوالات میں احادیث کی تعداد بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ جب تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی تو فرمایا کہ ہاں! اب امید ہے کہ فتویٰ دے سکتا ہے۔(۲)

یہ فقہاء محدثین کا گروہ ہے جس نے حدیث اور فقہ الحدیث کی مثالی خدمت انجام دی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس جماعت میں سب سے مشہور اور سب سے عظیم المرتبت شخصیت امام احمد بن حنبل کی ہے۔ وہ اس گروہ کے سرخیل ہیں اور سب سے زیادہ ان ہی نے اس طرزِ عمل کو فروغ دیا اور ان کا پورا مذہب فقہی اسی طرزِ عمل پر مبنی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں ایک ایک مسئلے میں کئی کئی اقوال ملتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں تھی، شاہ صاحب اس مکتب فقہی سے بہت زیادہ متاثر ہیں، انہوں نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں متعارض روایات پر عمل کے لئے جو فیصلہ کن گفتگو کی ہے، وہاں اس کی صراحت کی ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں دو طرح کی روایات منقول ہوں اور دونوں باہم متضاد نہ ہو، اور من قبیل عادت ہو تو دونوں کو مباح قرار دیا جائے گا اور اگر من قبیل عبادت ہو تو دونوں کو مستحب یا دونوں کو واجب قرار دیا جائے گا۔ یعنی دونوں صورتوں میں سے کسی پر عمل کر لیا

۱۔ دارمی حوالہ سابق ۲۔ غایۃ المنتہی۔

کسی سرزمین پر ایک حد کے نفاذ کی برکت وہاں چالیس روز نازل ہونے والی بارش کی برکت سے بہتر ہے

جائے تو مستحب یا واجب ادا ہو جائے گا۔(۱)

شاہ صاحب نے اس مکتب فقہی کے حاملین میں امام احمد کے علاوہ حضرت یزید بن ہارون، یحییٰ بن سعید القطان، امام اسحاق اور بعد کے ادوار میں امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، عبد بن حمید، دارمی، ابن ماجہ، ابو یعلی، ترمذی، نسائی، دار قطنی، حاکم، بیہقی، خطیب، دیلمی، اور ابن عبدالبر رحمہم اللہ کے اسماء گرامی بھی شمار کئے ہیں۔ ان میں بھی امام بخاری امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام ترمذی کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک ان ائمہ کی کتابیں اسی طرز فکر پر مرتب کی گئی ہیں اور وہ اس طرز فکر کے مجتہد کے لئے کافی ہیں۔(۲)

۲۔ اس کے بالمقابل دوسرا گروہ ''اہل الرائے'' کے نام سے مشہور تھا، جو فقہ وفتاویٰ کے باب میں اجتہاد و استنباط کی بہ نسبت روایت حدیث کے معاملے میں زیادہ محتاط اور حساس تھا، ان کا خیال تھا کہ کسی مسئلے کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ احادیث میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اس سے آسان اور محتاط صورت یہ ہے کہ حکم کی نسبت دوسرے فقہاء مجتہدین کی طرف کی جائے تاکہ اگر بیان حکم میں کوئی کمی بیشی ہو تو اس کی نسبت ذات رسالت مآب کی طرف نہ ہو۔

امام شعبیؒ کہتے تھے:

علی من دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم احب الینا فان کان فیہ زیادۃ او نقصان کان علی من دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی غیر نبی کی طرف نسبت کرنا ہمیں زیادہ پسند ہے، اس لئے کہ اگر اس میں کوئی کمی یا بیشی ہوگی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوگی۔

شاہ صاحب کی عبارت ہے:

۱۔ **حکی صحابی انہ صلی اللہ علیہ وسلم فعل شیئًا وحکی اخر انہ فعل شیئًا اخر فلا تعارض ویکونان مباحین ان کانا من باب العادۃ دون العبادۃ..... او یکونان جمیعًا مستحبین او واجبین یکفی احدھما کفایۃ الأخران کانا جمیعًا من باب القربۃ و قد نص حفاظ الصحابۃ علی مثلہ فی کثیر من السنن** (حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۳۸، باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ)

۲۔ الانصاف، ص ۴۶ تا ص ۵۶، دار النفائس للطباعۃ، بیروت لبنان، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء۔

حضرت ابراہیم نخعی فرماتے تھے:

اقول : قال عبداللہ وقال علقمة احب اتی۔

میں کسی حکم کے بارے میں یہ کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے یا حضرت علقمہ نے فرمایا ہے۔

اسی لئے ایسا بہت ہوتا تھا کہ کوئی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوتا تھا، مگر بطور احتیاط بعض صحابہ اور تابعین اس کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرنے کے بجائے اپنے فتویٰ کے طور پر اس کو بیان فرماتے تھے جس سے بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کا فتویٰ ہے، حالانکہ وہ قولِ رسول ہوتا تھا اور محض احتیاط کی بنا پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب نہیں کرتے تھے۔ اس فکر کی بنیاد دراصل اس روایت پر تھی جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

من کذب علیّ متعمّدًا فلیتبوا مقعدہ من النار۔(۱)

جو شخص میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس فکر کی جڑیں عہد صحابہ میں کافی حد تک مضبوط تھیں، بالخصوص عہد فاروقی تک نقل و روایت کے باب میں صحابہ حد درجہ محتاط تھے۔ حضرت عمر فاروق نے انصار کی ایک جماعت کو فہ روانہ فرمائی تو ان کو نصیحت فرمائی کہ آپ حضرات کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں، آپ وہاں ایسے لوگوں سے ملیں گے جن کے گھر اور سینے قرآن کی گونج سے آباد ہوں گے۔ وہ آپ کے پاس یہ کہتے ہوئے دوڑے آئیں گے کہ ''رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تشریف لائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تشریف لائے ہیں۔'' وہ آپ لوگوں سے حضور ﷺ کی احادیث کے بارے میں پوچھیں گے ایسے نازک موقع پر آپ حضرات روایت کے باب میں زیادہ سے زیادہ محتاط رہیں۔(۲)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کوئی بات بتانے لگتے تو چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔(۳)

ایک طرف نقل و روایت کے باب میں یہ احتیاط ان کو ملحوظ تھی، دوسری طرف ان کے پیش نظر وہ روایت اور آثار تھے جن میں کوئی مسئلہ منصوص نہ ملنے کی صورت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر

۱۔ بخاری (مشکوٰۃ کتاب العلم)۔ ۲۔ دارمی۔

۳۔ دارمی۔

اجتہاد بالرائے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب یمن کے گورنر بنا کر بھیجے جا رہے تھے تو حضور کے دریافت کرنے پر جب آخر میں انہوں نے یہ فرمایا کہ "اجتھد برائی ولا الو" (پیش آمدہ مسئلہ قرآن اور سنت میں نہ ملے گا تو اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا) تو حضور نے ان کی تصویب فرمائی اور ان کی اس توفیق حق پر اللہ کا شکر ادا فرمایا۔(۱)

حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے "کتاب اللہ" میں دیکھتے، اگر وہاں مسئلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے اور اگر نہ ملتا تو سنت رسول ﷺ میں غور فرماتے، اگر وہاں بھی نہ ملتا تو صحابہ سے دریافت فرماتے کہ میرے سامنے یہ مسئلہ آیا ہے کیا آپ میں سے کسی کے علم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل ہے؟ ایسے مواقع پر کبھی بہت سے لوگ جمع ہو جاتے اور کئی لوگ بیان کرنے لگتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ نہ خوش ہو جاتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے اندر علوم نبوت کے محافظین پیدا فرمائے اور اگر سنت سے بالکل رہنمائی نہ ملتی تو ارباب علم کو جمع فرما کر مشورہ کرتے اور اجتماعی غور وفکر سے جو طے ہو جاتا اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔(۲)

قاضی شریح فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ان کو لکھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آ جائے جو کتاب اللہ اور سنت رسول میں منصوص نہ ہو اور نہ تم سے پہلے کے فقہاء کا کوئی قول اس کے بارے میں منقول ہو تو دو چیزوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو، چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اسی طرح کرتے رہو اور چاہو تو رائے سے اجتناب کرو اور اسی احتیاط پر قائم رہو اور میں تمہارے لئے احتیاط ہی میں خیر سمجھتا ہوں۔(۳)

حضرت ابن عباس سے جب کوئی استفتاء کیا جاتا اور وہ مسئلہ قرآن میں مل جاتا تو قرآن سے جواب دیتے ورنہ حدیث سے جواب دینے کی کوشش کرتے، اگر حدیث میں بھی نہ ملتا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فیصلوں سے رہنمائی لیتے اور اگر ان سے بھی رہنمائی نہ ملتی تو اپنی رائے سے

۱۔ مشکوۃ شریف۔ ۲۔ الانصاف، ص ۵۱۔

۳۔ الانصاف: حوالۂ بالا۔

اجتہاد فرماتے۔(۱)

چنانچہ اہل الرائے کے طبقہ نے اجتہاد و استنباط پر زور دیا، اس کے لئے باقاعدہ اصول و ضوابط مقرر کئے، تخریج و تنقیح کے قواعد متعین کئے اور روایت (بمعنی علوسند) سے زیادہ فقاہت و درایت کو بنیاد بنایا، شاہ صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہ کا یہ قول اسی پس منظر میں لیا ہے، انہوں نے حضرت امام اوزاعی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ابراهيم افقه من سالم ولو لا فضل الصحبة لقلت علمة افقهه من ابن عمرؓ(۲)

ابراہیم نخعی سالم کے مقابلے میں زیادہ فقیہ ہیں اور اگر شرف صحابیت حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ حضرت ابن عمرؓ کے مقابلے میں حضرت علقمہ کا تفقہ زیادہ مضبوط ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے واقعات کی بڑی تلخ ترجمانی کی ہے اور ائمہ مجتہدین کے تلامذہ نے ان کے مجتہدات کو محفوظ اور مدوّن کرنے کے سلسلے میں جو مساعی جمیلہ انجام دیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس طبقہ کے نزدیک چونکہ اجتہاد و تخریج کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اس لئے ان کے تلامذہ اور متبعین نے اپنی جدوجہد کو اسی رخ پر مرکوز کیا اور روایات و آثار سے زیادہ فقہی مجتہدات اور ائمہ کے اقوال کے حفظ و تدوین، ان سے قواعد و اصول کے استنباط و استخراج، مسائل کے درجات کی تعیین، طبقات فقہاء اور طبقاتِ کتب کی تحدید پر پورا زور صرف کیا۔ شاہ صاحب نے اس طبقے کی جو تصویر کشی کی ہے، اس میں شاہ صاحب کے عہد کے حالات کی بنا پر کچھ زیادہ تلخی آ گئی ہے، اور اس پر بہت کچھ کلام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب نے ''اہل الرائے'' کا جو مفہوم بیان کیا ہے یا جن لوگوں پر اس اصطلاح کا اطلاق کیا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ مگر اس حد تک بہرحال درست ہے کہ اس دور میں علماء کا ایک (مختصر) طبقہ ایسا ضرور موجود تھا جو روایت سے زیادہ درایت اور اجتہاد کے اصول پر قائم تھا۔

۱۔ الانصاف: حوالہ بالا۔ ۲۔ ایضاً۔

۳۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ نے یہ بات ترجیحی اصول کے طور پر کہی تھی جیسا کہ اس قول کے پس منظر سے واضح ہوتا ہے۔ اس کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ روایت کے مقابلے میں کسی کا اجتہاد ترجیحی اہمیت رکھتا ہے۔ معاذ اللہ۔

☆☆☆ میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو عقل والا نہیں پایا (ابو عبید) ☆☆☆

راہِ اعتدال:

ان دونوں طبقات کے تذکرے کے بعد شاہ صاحب نے جو راہِ عمل پیش کی ہے وہ انتہائی معتدل اور مبنی برانصاف ہے، فرماتے ہیں:

''کلام فقہاء پر تخریج اور الفاظِ احادیث کا تتبع دین میں دونوں کی مستحکم اصل موجود ہے اور ہر زمانہ کے اعلام محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا تخریج میں قدم پیچھے ہے اور الفاظِ حدیث کے تتبع میں آگے اور بعض اس کے برعکس ہیں۔ ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراطِ مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے، اس محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سنتکم واللہ الذی لا الہ الا ھو . بینھما بین الغالی والجافی۔

یعنی اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط وتفریط کے بیچ میں ہے۔ جو اربابِ حدیث ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی آراء پر پیش کریں، اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کرتے ہیں انہیں بھی چاہئے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان کریں، اور ایسا طریقہ نہ اختیار کریں کہ فرمودۂ نبوی کی صریح مخالفت کا انہیں بار اُٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ان اصولِ حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے، جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی انسان ہی تھے اور شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند نہیں پیش کی جاسکتی اور اس اصول پرستی کے تشدد میں حدیث یا قیاسِ صحیح کو رد نہ کرے، مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور ناقابل استناد ٹھہرا دی جاتی ہیں۔ حالانکہ فی نفسہٖ وہ قولِ رسول ہوا کرتی ہیں۔

البینۃ حجۃ متعدیۃ والاقرار حجۃ قاصرۃ شہادت حجت متعدیہ اور اقرار حجت قاصرہ ہے

جیسا کہ ابن حزم نے اس طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو نا قابل حجت قرار دے دیا۔ صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہٖ صحیح اور سلسلۂ سند متصل ہے، اور اس طرح کی روایت تعارض کے وقت قابلِ استدلال ہوتی ہے۔(۱)

روایت اور درایت کے بارے میں معتدل نقطۂ نظر:

شاہ صاحب نے ارباب حدیث کی ایک اور اصولی کوتاہی کی نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اعتناء نہیں کرتا، تو کلیتہً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم اور راجح مانی جاتی ہے، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح کے کتنے ہی اسباب و دواعی موجود ہوں۔

متنِ احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہئے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلامِ نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط ان فقہاء پر بھی عائد ہوتی ہے جو ائمہ مجتہدین کے اصول اور فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ان کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ کرید کرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان ائمہ کے اصول اور ان کی تصریحات سے دور کا تعلق ہو، نہ علماء لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں اور نہ عرفِ عام میں ایسا طریقۂ سخن فہمی رائج ہو۔ بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے یا ایک ادنیٰ مشابہت تلاش کر لی جائے اور اسے قول مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیارِ حکم ٹھہرا لیا جائے، حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آ جائے اور یہ مسائل براہِ راست اس سے پوچھے جائیں تو وہ اس طرح کی تدقیقات وتخریجات کا انکار کر دے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ

۱۔ الانصاف، ص ۶۲۔

درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے اور اس کا حق وہیں تک ممکن ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصولِ فہم وتدبر کے مطابق اجازت دیں۔

اس کے علاوہ ان فقہاء کو اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اصولوں کی پیروی کے جوش میں ان مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیں جنہیں محدثین میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔(۱)

اصولی طور پر شاہ صاحب کی یہ فکر انتہائی معتدل اور دور رس نتائج کی حامل ہے۔ شاہ صاحب کی ان تنبیہات کا امت نے بڑا خوشگوار اثر قبول کیا، بیداری پیدا ہوئی، اور امت کے مختلف طبقات نے ان کے زیر اثر اپنے فکر وعمل میں اعتدال لانے کی کوشش کی۔

شاہ صاحب کی تنبیہات درحقیقت علامہ ابوسلیمان الخطابیؒ کی کتاب ''معالم السنن'' سے مستفاد ہیں۔ جس کا حضرت شاہ صاحب نے الانصاف میں حوالہ دیا ہے اور ایک طویل اقتباس بھی نقل کیا ہے۔(۲)

البتہ خطابی کے کلام میں وہ زورِ استدلال اور عقلی انداز نہیں ہے جو شاہ صاحب کے یہاں ہے اسی طرح خطابی کے کلام میں لب ولہجہ کی ناگواریت کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے، جبکہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں کافی حد تک توازن موجود ہے۔

تنقیدی مطالعہ کی ضرورت:

''کافی حد تک'' کی قید اس بنا پر ہے کہ ادوارِ فقہی کی تصویر کشی میں شاہ صاحب کے یہاں بھی مکمل توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اسی طرح بعض اصولی باتوں کی شاہ صاحب نے جو مثالیں دی ہیں وہ پوری طرح منطبق نہیں ہیں۔ مثلاً اسی آخری ٹکڑے میں اس اصولی گفتگو کے ذیل میں کہ محض اصولِ مستخرجہ کی بنا پر مقبول اور صحیح روایات کو رد نہیں کرنا چاہئے (اس اصول سے فقہاء حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ان کے اصول مستخرجہ کی بنیاد میں اس کا لحاظ کیا جاتا ہے) اس کی ایک مثال شاہ صاحب نے حدیث ''مصراۃ'' پیش کی ہے۔ اس پر کافی گفتگو کی جاسکتی ہے کہ فقہاء حنفیہ نے حدیث مصراۃ کو محض اپنے اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ بعض قرآنی نصوص اور اسلام کے عام اصولِ مکافات کی بناء پر چھوڑا ہے۔(۳)

۱۔ الانصاف، ص ۵۷ تا ۶۳ ۲۔ ایضاً، ص ۶۴ تا ۶۷۔

۳۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: العرف الشذی اور اعلاء السنن۔

☆ ایسا عمل جو شرعاً ثابت ہو وہ مقدم ہوتا ہے ایسے عمل پر جو شرط سے ثابت ہو ☆

اس طرح کا عدم توازن شاہ صاحب کے یہاں فقہ و اجتہاد کے مباحث میں کئی جگہ کھٹکتا ہے اور اصولی طور پر نتیجۂ بحث سے اتفاق کے باوجود تمثیلی یا تصویری اعتبار سے شاہ صاحب سے اتفاق بہت مشکل نظر آتا ہے، ہوسکتا ہے یہ میرے فکر و نظر او علم و مطالعہ کی نارسائی ہو لیکن ارباب نظر کو اس جانب توجہ دلاتے ہوئے اس قدر کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ فقہ و اجتہاد کے موضوع پر شاہ صاحب کے کلام کا تنقیدی مطالعہ بھی ضرور ہونا چاہئے۔

اجتہاد۔ مفہوم اور مراتب:

شاہ صاحب کے یہاں ایک اہم ترین بحث اجتہاد کے مفہوم، مراتب اور دائرۂ کار کی بھی ہے۔ شاہ صاحب نے ''الانصاف'' اور ''عقد الجید'' میں اجتہاد کے مفہوم، مراتب اور اس کے طریقۂ حصول پر کافی مفصل بحث کی ہے۔ الانصاف میں فرماتے ہیں:

''اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ انسان تتبع نصوص و آثار اور اصول و قواعد کی تخریج و استحضار کے ذریعہ ایسی معرفت اور صلاحیت حاصل کرلے کہ وہ زیادہ تر مسائل و واقعات کا جواب دے سکے اور اس کے جوابات کا بیشتر حصہ واضح اور صریح و صحیح ہو۔(۱)

عقد الجید میں مجتہد مطلق کی تعریف یہ کی گئی ہے:

''مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہب سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں، جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس قدر علم لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طرق ہیں تقریباً سب کا علم ہو اگر ان میں کسی ایک میں بھی کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہئے۔''(۲)

مجتہد کا دائرۂ عمل:

مجتہد کے فرائض کیا ہیں؟ اور اس کا دائرۂ عمل کیا ہے؟ شاہ صاحب نے اس پر مصفّٰی شرح مؤطا میں کافی تفصیلی اور عمدہ کلام کیا ہے، اس کے بعض اہم حصے پیش خدمت ہیں:

۱۔ الانصاف، ص ۱۰۲۔

۲۔ عقد الجید، مبحث فی حقیقۃ الاجتہاد، ص ۷، مطبوعہ دار الاخلاص ترکی۔

کسی سرزمین پر ایک حد کے نفاذ کی برکت وہاں چالیس روز نازل ہونے والی بارش کی برکت سے بہتر ہے

''مجتہد کے فرائض درج ذیل ہیں:

۱۔ مشتبہ الفاظ کی وضاحت کرنا، اس ضمن میں چار چیزیں آتی ہیں۔

(۱) تقسیم، (۲) مثال، (۳) اصل مطلوبہ معنی کی تعیین، اور (۴) دلائل شرعیہ کی جستجو۔

(۱) تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ شیء مطلوب کا وہ عام حصہ لیا جائے، جس کے عموم میں خود یہ بھی شامل ہو اور اس کے دیگر تمام افراد، پھر اس ضمن میں داخل تمام اشیاء کا موازنہ کیا جائے، اور شیء مطلوب اور اس کے دیگر نظائر کے درمیان وجوہ فرق کو محسوس کیا جائے اور ان کے درمیان ایسے حدود و قیود مقرر کئے جائیں کہ مفہوم عام اصطلاح منطق میں بمنزلہ جنس ہو جائے اور دیگر قیودات بمنزلہ فصل، مثلاً ''سفر سے یا وطن سے خروج'' عام معنی کے لحاظ سے اس کا اطلاق تفریح کے لئے سیر گلشن پر بھی ہوتا ہے اور بلا مقصد ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے پر بھی اور با مقصد طور پر کسی خاص منزل کی طرف سفر پر بھی، لیکن غور کیا جائے تو ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ سفر شرعی اور سفر تفریح کے درمیان فرق یہ ہے کہ سفر تفریح میں منزل قریب اور واپسی آسان ہوتی ہے جب کہ سفر شرعی میں یہ بات نہیں ہوتی، اسی طرح سفر شرعی اور بے مقصد مارے مارے پھرنے میں بھی فرق ظاہر ہے کہ ایک با مقصد ہے اور دوسرا بے مقصد۔

(۲) مثال کا مطلب ہے حتی الوسع ان تمام جزئیات کا استحضار جن پر اس کلمہ کا لغوی طور پر اطلاق ممکن ہو۔ مثلاً ''سفر'' کا اطلاق کہاں سے کہاں تک پر ہو سکتا ہے، جدہ سے مکہ تک، عسفان سے مکہ تک، مکہ سے مدینہ تک، حیدر آباد سے پٹنہ تک وغیرہ۔

(۳) اصل مطلوبہ معنی کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ شیء کے تمام وجودی اور عقلی لوازم پر ذہنی وجدان سے غور کیا جائے اور پھر اس کے تمام اطلاقات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مقررہ معیار پر پرکھا جائے، کہ اصل مطلوبہ حصہ کیا ہے؟ مثلاً ''خف'' پاؤں کا لباس ہے، مگر یہ کپڑے کا نہیں بلکہ چمڑے کا لباس ہے۔ یہ ٹخنے تک بھی ہو سکتا ہے، اور ٹخنے سے اوپر گھٹنے تک بھی، مگر ٹخنے سے اوپر ہو یا نہ ہو اصل حکم شرعی پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ مطلوب صرف اس قدر ہے کہ محل فرض پر خف ہے یا نہیں۔ قطع نظر کہ اس سے زیادہ ہے یا نہیں؟

(۴) دلائل شرعیہ کے تتبع کا مفہوم یہ ہے کہ متعلقہ تمام دلائل پر اس طرح غور کیا جائے کہ کن قیودات کی موجودگی میں حکم شرعی پایا جاتا ہے اور کن کی موجودگی میں نہیں، اس طرح تمام دلائل (نصوص و آثار) سامنے رکھ کر مجتہد کوئی ایسا جامع مانع اصول یا تعریف دریافت کر سکتا ہے جس کے مطابق حکم شرعی کا اطلاق کیا جا سکے، مثلاً جمع تمتع کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کا اطلاق کس حج پر ہوگا؟ اس سلسلے میں اگر متعلقہ دلائل شرعیہ کو جمع کیا جائے تو حج تمتع کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ ایک آیت کریمہ ہے:

فمن تمتع بالعمرة الى الحج (بقرہ:۱۹۶)

پس جو عمرہ کو حج کے ساتھ کرنے کا فائدہ اٹھائے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، حج تمتع نام ہے حج اور عمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنے کا۔ اور آیت کریمہ کا دوسرا ٹکڑا ہے:

ذلک لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام (بقرہ:۱۹۶)

یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو مسجد حرام کا حاضر باش نہ ہو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف آفاقی کے لئے ہے، مکی کے لئے نہیں۔

اس طرح دونوں آیتوں میں غور کرنے سے ثابت ہوا کہ حج تمتع یہ ہے کہ کوئی آفاقی شخص اشہر حج میں حج اور عمرہ کو جمع کرے۔

۲۔ ہر شے کے ارکان، شرائط اور آداب کی تعیین کرنا۔ اس کی بنیاد بھی نصوص اور شرعی اشارات کے تتبع اور ان مقامات کے استقرار پر ہے جہاں شریعت نے اس کا ذکر کیا ہو، اسی طرح ذہن میں حاصل شدہ مفہوم میں سے کون سا حصہ شرعی ہے اور کون سا عادی؟ اس کو دلائل اور قرائن سے ثابت کیا جائے۔

۳۔ صیغۂ امر سے وجوب مراد ہے یا استحباب؟ اور صیغۂ نہی سے حرمت مراد ہے یا کراہیت؟ اس کی تعیین۔

۴۔ دلائل کے ساتھ علتِ حکم کی معرفت، اسی طرح علت کے مطابق حکم کے اطلاق و تقیید کی معرفت بھی ضروری ہے۔

احکام میں علت کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ قانونِ اسلامی ایک آفاقی اور دائمی

قانون ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ قیامت تک آنے والے مسائل و جزئیات کی تصریح قرآن و حدیث کے صفحات میں کر دی جاتی۔ اسی لئے شریعت نے احکام کے ساتھ ایک یا چند اوصاف و علل وابستہ کر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر اس جیسے دوسرے مسائل و جزئیات کا حکم بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، مجتہد کی ذمہ داری ہے کہ وہ نصوص میں تدبر و تفکر کر کے ان علتوں کا استخراج کرے جو ان احکام کے پس پردہ موجود ہیں۔

۵۔ احترازی اور اتفاقی قیود کی معرفت۔

۶۔ ایسے جامع مانع قاعدہ کا استخراج جس میں حکم کے اطلاق و تقیید یا قید احترازی و اتفاقی کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

۷۔ متعلقہ احکام کے سلسلے میں تخریج شدہ اقوال اور ایک باب سے دوسرے باب کی طرف اس کی منتقلی۔

۸۔ نئے مسائل کی تفریع عمومِ احکام و اصول کی روشنی میں۔

۹۔ دلائل میں اختلاف کی صورت میں جمع و تطبیق یا نسخ و ترجیح۔

جو عالم مذکورہ امور پر نگاہ رکھے اور ان پر مکمل مہارت حاصل کر لے وہ مجتہد مطلق کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ وہ فتاویٰ جاری کر سکتا ہے اور اس پر کسی دوسرے عالم کی تقلید بھی لازم نہیں رہے گی۔ بلکہ اگر اللہ توفیق دے اور اس کے لئے اسباب و وسائل فراہم ہوں تو دوسروں کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ایسے ماہر شخص کی تقلید کریں اور دینی مسائل میں اس پر اعتماد کریں۔

شاہ صاحب نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ فن اوّلاً حضرت امام شافعیؒ کی کتاب سے حاصل کیا۔ پھر بعد میں علامہ بغویؒ کی کتاب ''شرح السنۃ'' سے بھی انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ انھوں نے یہ فن اگرچہ کسی استاذ سے بالمشافہ نہیں پڑھا، صرف کتابوں کے مطالعہ سے ان کو یہ حاصل ہوا، مگر خود کتابوں سے تحصیلِ فن کا طریقہ تو بہرحال انھوں نے اپنے اساتذہ اور ائمہ فن سے سیکھا اور پھر اسی کی روشنی میں انھوں نے کتابوں کو اپنا رہنما بنایا۔(۱)

حضرت شاہ صاحب کا یہ علمی اور بصیرت افروز مقدمہ ان کی فنی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

۱۔ مقدمہ مصفی شرح المؤطا علی المسوی، ص ۴۶ تا ۵۳، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء۔

طبقاتِ فقہاء کی مشہور تقسیم اور شاہ صاحب کا نقطۂ نظر:

فقہاء حنفیہ کے یہاں طبقاتِ فقہاء کی بحث بھی کافی پیچیدہ ہوگئی تھی۔ ابن کمال پاشا رومی (متوفی ۹۴۰ھ) نے اپنے بعض رسائل میں فقہاء کے سات طبقات شمار کرائے تھے۔ اگرچہ کہ حنفی مصنفین عام طور پر اس کا اعادہ کر رہے تھے، مگر پھر بھی بعض حلقوں میں اس تعلق سے کچھ بے یقینی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بالخصوص ان طبقات کے تحت جن فقہاء کے اسماء گرامی شمار کرائے جاتے تھے، وہ بہر حال قابلِ اعتراض تھا۔ علامہ ہارون بن بہاء الدین بن شہاب الدین المرجانی الحنفی نے اس پر کھل کر تنقید کی۔ مقدر بن کمال پاشا کی تقسیم میں حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد کو طبقہ ثانیہ یعنی ''مجتہد فی المذہب'' میں رکھا گیا ہے، جس طبقہ کے فقہاء اصولوں کے استنباط کی قدرت نہیں رکھتے، اصولوں میں وہ اپنے امام کے مقلد ہوتے ہیں، البتہ فروع میں امام کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر سکتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں اور اصول کی کئی کتابوں میں صاحبین کے اصولی اختلاف کا تذکرہ موجود ہے، قاضی ابو زید دبوسی نے ''تاسیس النظر'' میں مستقل ایک باب ان حضرات کے اصولی اختلاف پر قائم کیا ہے، اور اس کا احساس دوسرے مکتب فقہ کے علماء وفقہاء کو بھی ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے تہذیب الاسماء میں ابو المعالی الجوینی کے حوالے سے امام مزنی کے مختارات کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام مزنی کے مختارات وترجیحات مذہب شافعی کا حصہ ہیں، ان کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے اس لئے کہ امام مزنی حنفیہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے درجے کے مجتہد فقیہ نہیں ہیں، یہ حضرات تو اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں جب کہ امام مزنی اختلاف نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں کئی لوگوں کو اختلاف ہے کہ ان کا شمار فقہاء میں ہونا چاہئے یا حفاظ حدیث میں؟ امام ابو جعفر طبری نے ان کا شمار فقہاء میں نہیں کیا ہے، بلکہ کہا ہے کہ یہ حفاظ حدیث میں ہیں، اس کے باوجود یہ مجتہد مطلق ہیں، اس لحاظ سے حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد مجتہد مطلق کیوں نہیں قرار پا سکتے؟(۱)

۱۔ النافع الکبیر مقدمہ الجامع الصغیر مولانا عبدالحئی لکھنوی، ص ۱۱، ۱۲، ادارۃ القرآن، کراچی ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی اعتراضات کئے گئے ہیں۔(۱)

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی حساس فکر نے اس کو کیونکر نہ محسوس کیا ہوگا؟ شاہ صاحب نے اپنے کسی اعتراض یا احساس کا ذکر کئے بغیر ''الانصاف'' میں طبقات فقہاء کی تقسیم کو ایک دوسرا رخ دے دیا ہے اور اس طرح عملاً انھوں نے ابن کمال پاشا کی تقسیم کے حق میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیا ہے۔ انھوں نے جو رخ دیا ہے وہ انتہائی مثبت، معقول اور مبنی بر حقیقت ہے۔

سابقہ تقسیم میں مجتہد کی صرف دو قسمیں تھیں، مجتہد مطلق مستقل، اور مجتہد فی المذہب (مجتہد فی المسائل اصلاً مجتہد نہیں ہوتا) شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ مجتہد کی تین قسمیں ہیں۔ مجتہد، مطلق مستقل، مجتہد مطلق منتسب، مجتہد فی المذہب۔

۱۔ مجتہد مطلق مستقل کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) وہ فقیہ النفس، سلیم الفکر اور زبردست قوتِ استنباط کا مالک ہو، قرآن، حدیث، مذاہب سلف، لغت اور قیاس ان پانچوں چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، نصوص اور آثار پر ایسی گہری نگاہ ہو کہ وہ مختلف دلائل میں جمع و تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکتا ہو۔

(ب) مسائل کے استنباط کے لئے خود اصول و قواعد مقرر کرتا ہو اور اس میں وہ کسی کا مقلد نہ ہو۔

(ج) نئے پیش آمدہ مسائل و جزئیات کی تفریع کرتا ہو۔

تعریف کے یہ تین ٹکڑے دوسرے فقہاء کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس میں ایک چوتھے ٹکڑے کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ کہ:

(د) اسے آسمانی مقبولیت بھی حاصل ہو اور علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین اور اصولیین کی مختلف جماعتوں نے اس کے طرزِ اجتہاد اور مجتہدات کو قبول کیا ہو اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا ہو اور اس کے ماننے والے بڑی تعداد میں ہر دور میں موجود رہے ہوں، مثلاً ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ)۔

۲۔ مجتہد مطلق منتسب: وہ ہے جو ان تمام شرائط اجتہاد کا حامل ہو جن کا ذکر مجتہد مطلق مستقل میں کیا گیا ہے۔ اسی لئے وہ اصولوں میں بھی امام سے اختلاف رکھتا ہو، یہ بھی مجتہد مطلق ہی ہوتا ہے، مگر منہج فکر اور طریق استنباط اس نے اپنے امام سے حاصل کیا ہو، اور اس کا فکری اور

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے راقم سطور کا مقالہ ''طبقاتِ فقہاء کی حقیقت'' شائع شدہ ترجمان دارالعلوم دیلی

اجتہادی زاویہ اپنے امام کے طرزِ اجتہاد سے ماخوذ ہو اور اسی بنا پر وہ اپنے امام کی طرف منسوب ہو۔

۳۔ مجتہد فی المذہب: وہ ہے جو تخریج واستنباط کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو، اپنے مذہب کا بصیرت مند اور محقق عالم ہو، مذہب کے اصولوں اور تفصیلی دلائل سے پوری طرح باخبر ہو، وہ جزئیات اور نئے پیش آمدہ مسائل میں اپنے مذہب کے اصولوں کی روشنی میں استنباط کر سکتا ہو۔ مگر اصول میں وہ اپنے امام کا پابند ہو، اصولی طور پر وہ اپنے امام سے اختلاف نہ کر سکتا ہو۔

شاہ صاحب نے ان تینوں درجات کو طب اور شاعری کی مثالوں سے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تقسیم، علم تفسیر، تصوف اور دیگر علوم میں بھی جاری ہوگی۔(۱)

اگرچہ شاہ صاحب نے کوئی نئی فکر پیش نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کی جڑیں ان سے قبل کے مصنفین ومحققین شوافع کے یہاں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر مکی نے اپنے رسالہ ''سنن المغارۃ علی من اظہر معرۃ تقولہ فی الحنا وعوارہ'' میں اس تقسیم کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح میزان میں علامہ عبدالوہاب شعرانی نے بھی علامہ جلال الدین سیوطی کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔(۲)

لیکن مجدد کا اصل کام یہ نہیں کہ وہ ہر باب میں نئی چیز پیش کرے، بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو بروقت اور نئے طور پر پیش کرے اور یہ کارنامہ شاہ صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔

سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا نہیں؟

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ یہ سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا موقوف ہو چکا ہے؟ یہ مسئلہ بھی گزشتہ ادوار میں کافی موضوعِ بحث رہ چکا ہے، میزان میں امام عبدالوہاب شعرانی نے جلال الدین سیوطی سے نقل کیا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں، اجتہاد مطلق غیر منتسب، مثلاً ائمہ اربعہ کا اجتہاد، اور اجتہاد مطلق منتسب۔ مثلاً ان ائمہ کے تلامذہ اور اصحاب کا اجتہاد۔

اجتہاد مطلق غیر منتسب کا دعویٰ ائمہ اربعہ کے بعد کسی نے نہیں کیا، صرف ایک امام محمد بن

۱۔ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، ص ۸۰، ۷۳۔

۲۔ النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر، ص ۱۴۔

جریر طبری نے اس کا دعویٰ کیا تھا، مگر کسی نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ رہا یہ کہ اب عملاً کسی کے لئے ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مقام تک پہنچنا ممکن ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہنچنا ممکن ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے عدمِ امکان یا عدمِ وقوع ثابت ہوتا ہو، لیکن واقعاتی طور پر ائمہ اربعہ کے بعد کوئی اس مقام تک نہیں پہنچ سکا۔ امام طبری نے دعویٰ بھی کیا تو لوگوں نے لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا، اس لئے کہ اب کوئی منہجِ اجتہاد یا طرزِ استنباط باقی نہیں جو سابقہ ائمہ نے استعمال نہ کیا ہو۔ اسلئے بعد میں آنے والا ہر امام انہی مناہجِ استنباط میں سے کسی ایک منہج کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ جو ائمہ اربعہ نے اختیار کیا تھا اور یہ اجتہاد منتسب ہے جس کا دروازہ بند نہیں ہے البتہ کوئی نیا منہج استنباط پیدا کرنا اب عملاً ناممکن ہے۔(۱)

علامہ بحرالعلوم لکھنوی رحمہ اللہ نے ''شرح تحریر الاصول'' میں اور ''شرح مسلم الثبوت'' میں اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد اجتہاد مطلق کا اور صاحب ''الکنز'' علامہ نسفی کے ''اجتہاد فی المذہب'' کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ علامہ بحرالعلوم نے اس کو بالکل بے بنیاد اور تعصب و تنگ نظری کی پیداوار قرار دیا ہے اور اس کو فتویٰ بلاعلم، ضلالت اور دعویٰ غیب جیسے سخت الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔(۲)

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں اس نازک مسئلہ سے تعرض فرمایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے انصاف کی بات کہی ہے۔ شاہ صاحب کا اندازِ بیاں انتہائی بصیرت اور حقیقت پسندانہ ہے، اس میں انھوں نے کسی جانب داری کی بغیر صرف واقعات اور حقائق کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

انھوں نے اس مسئلہ کو فکری اور نظریاتی طور پر دیکھنے کے بجائے واقعاتی طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے طرزِ عمل سے یہ اشارہ دیا ہے، کہ بحث عقلی امکان یا شرعی جواز کی نہیں ہے کہ خود یہ اصطلاحات شریعت کی اساسیات میں موجود نہیں تو پھر اس پر شریعت کی دلیل کیوں مانگی جائے؟ اور جو چیز تاریخ میں ایک بار وقوع پذیر ہو چکی ہو اس کے بارے میں عقلی عدم امکان کا سوال کیوں اُٹھایا جائے؟ مگر واقعہ کیا ہے؟ اور تاریخی حقائق کیا کہتے ہیں؟ فیصلہ ان کی روشنی میں ہوگا۔

مجتہدین کا یہ سلسلہ مرضیٔ الٰہی سے شروع ہوا اور بطور ایک نعمت کے یہ اجتہاد اس امت مرحومہ کو دیا گیا۔ یہ نعمت کب تک کس معیار کی باقی رہنی چاہئے۔ اس کے لئے کوئی شرعی دلیل نہیں

۱۔ النافع الکبیر، ص ۱۴، ۱۵۔ ۲۔ النافع الکبیر، ص ۱۵، ۱۶۔

☆☆☆ میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو عقل والا نہیں پایا (ابو عبید) ☆☆☆

پیش کی جا سکتی لیکن واقعات و تاریخی حقائق کے تناظر میں یہ فیصلہ ممکن ہے کہ اللہ کی مرضی اس نعمت کے کس معیار کی کب تک رہی؟ اور کب تک نہیں رہی؟

واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے مسئلہ کی بہت اہم نبض پکڑی ہے اور موضوع کی آخری تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔

اجتہاد منتسب واقعاتی طور پر ممکن ہے:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجتہاد مطلق مستقل کی جہاں تک بات ہے، عقلی طور پر یہ ممکن ضرور ہے، مگر بعد میں علوم وفنون میں جو پھیلاؤ پیدا ہوا اور عہدِ نبوت سے دوری کی بنا پر قرآن و حدیث کے سمجھنے کے لئے طرح طرح کے اتنے علوم وضع کئے گئے کہ کسی ایک شخص کے لئے بیک وقت ان تمام میں مکمل مہارت حاصل کرنا ممکن نہ رہا اور جب تک تمام علومِ ضروریہ میں مکمل مہارت نہ ہو اجتہاد کے اعلیٰ مقام تک انسان نہیں پہنچ سکتا۔

والنفس الانسانية وان كانت زكية لها حدّ معلوم تعجز عما وراءه وانما كان هذا ميسراً للطراز الاول من المجتهدين حين كان العهد قريباً والعلوم غير منشعبة على انه لم يتيسر ذلك ايضاً الا لنفوسٍ قليلة وهم مع ذلك كانو مقيدين بمشائخهم معتمدين عليهم ولكن لكثرة تصرّفاتهم فى العلم صاروا مستقلين۔(۱)

یعنی نفس انسانی خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو مگر اس کی ایک حد مقرر ہے۔ اس سے زیادہ وہ پرواز نہیں کر سکتا، یہ صرف پہلے طرز کے مجتہدین ہی کے لئے ممکن تھا، اس لئے کہ عہدِ نبوت قریب تھا اور علوم میں اس قدر پھیلاؤ اور وسعت نہ تھی، اس کے باوجود متقدمین میں بھی صرف چند نفوس ہی کو یہ مقام (اجتہاد مطلق مستقل) حاصل ہو سکا اور خود وہ بھی اپنے اساتذہ و مشائخ کے طرزِ اجتہاد کے پابند تھے۔ مگر علم میں ان کے کثرت تصرف کی بنا پر یہ حضرات خود مستقل بالذات ہو گئے۔"

اس مقام پر حضرت شاہ صاحب نے امام بلقینی رحمہ اللہ (جو کہ مجتہد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے) اور ان کے تلمیذ امام ابوزرعہ کا ایک دلچسپ مکالمہ درج کیا ہے:

۱۔ الانصاف، ص ۷۲۔

فرض وہ امر ہے جس کے کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہو (اصول فقہ)

''ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ امام بلقینی سے کہا کہ شیخ تقی الدین السبکی کے اجتہادات میں کیا کمی ہے؟ وہ تو پورے مجتہد ہیں، پھر کیوں تقلید کرتے ہیں؟ میں نے اس موقع پر خود اپنے شیخ حضرت بلقینی کا ذکر پاس ولحاظ میں نہیں کیا، ورنہ میں چاہتا تھا کہ شیخ سبکی کے ساتھ خود ان کا نام بھی لے کر پوچھوں۔ میرے اس سوال پر وہ خاموش رہے، میں نے عرض کیا شاید اس کا سبب یہ ہو کہ موجودہ دور میں جتنے عہدے اور مناصب ہیں وہ مذاہب اربعہ کے مقلدین کے لئے مخصوص ہیں، اگر وہ ان کے دائرہ تقلید سے نکل جائیں اور اجتہاد مستقل کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان کو کوئی عہدہ نہیں مل سکے گا اور وہ مقام قضا سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ لوگ ان سے استفتاء کرنا ترک کر دیں گے اور ان پر بدعتی ہونے کا الزام آ جائے گا۔ میری بات پر حضرت بلقینی مسکرائے اور اس طرح گویا مجھ سے اتفاق کا اظہار فرمایا۔''

شاہ صاحب نے یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں اور میں اس بدگمانی کو مناسب نہیں سمجھتا کہ ان عظیم ہستیوں نے محض قضا اور دنیا کے عارضی عہدوں کے حصول کے لئے اپنے فرائض منصبی کے بارے میں کتمان کا معاملہ فرمایا۔ یہ ان بلند و بالا شخصیات کے ساتھ حق تلفی اور ناانصافی ہے اور شیخ بلقینی کا محض مسکرانا اتفاق کی دلیل نہیں ہے، اصل بات وہی ہے جس کا تذکرہ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''شرح التنبیہ فی باب الطلاق'' میں کیا ہے کہ اس طرح کی جن شخصیات کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اجتہاد مطلق کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ اس کا مطلب اجتہاد مستقل نہیں بلکہ اجتہاد مطلق منتسب ہے۔ صاحب التنبیہ، ابن الصباغ امام الحرمین اور امام غزالی یہ تمام حضرات اجتہاد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے، نہ کہ اجتہاد مستقل کے مقام پر۔(۱)

رہا یہ کہ ''اجتہاد مطلق منتسب'' کے مقام پر اب کوئی فائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو علامہ نووی نے ''شرح المہذب'' میں اس کی تصریح کی ہے کہ یہ مقام تا قیامت باقی رہے گا، شرعاً اس کا انقطاع جائز نہیں، اس لئے کہ یہ فرض کفایہ ہے، اگر تمام اہل زمانہ بالکلیہ اس کو ترک کر دیں تو سب گنہگار ہوں گے، جیسا کہ علامہ ماوردی، علامہ رویانی اور علامہ بغوی نے اس کی صراحت کی ہے۔(۲)

شاہ صاحب نے تاریخی طور پر مذاہب اربعہ کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ کس مذہب میں کس درجہ کے مجتہدین کس صدی تک ہوئے؟ اس تجزیے کے بعض حصوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر فی

۱۔ الانصاف، ص ۷۳۔ ۲۔ الانصاف، ص ۷۴۔

الواقع یہ تجزیہ بصیرت افروز ہے۔

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مذہب حنفی میں تیسری صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو اقوالِ فقہاء اور قواعد فقہیہ کے ساتھ حدیث میں بھی پوری مہارت رکھتا ہو اور حنفیہ ہمیشہ اس باب میں پیچھے رہے، البتہ اجتہاد فی المذہب (جس کی ادنیٰ شرط یہ ہے کہ سرخسی کی مبسوط کا حافظ ہو) کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی طرح مذہب مالکی میں بھی مجتہد منتسب کم ہوئے اور جو لوگ اس مقام پر پہنچے ان کے تفردات مذہب کا حصہ نہ بن سکے، مثلاً ابن عبدالبر، اور قاضی ابوبکر بن العربی۔

مذہب حنبلی کا دائرہ ہر دور میں بہت مختصر رہا، لیکن نویں صدی تک ہر طبقہ میں مجتہدین ہوتے رہے پھر اس کا زور ہی ٹوٹ گیا اور مصر و بغداد کے علاوہ دنیا کے دیگر حصوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد بہت مختصر رہ گئی۔

علاوہ ازیں امام احمد کے مذہب کی حیثیت، مذہب شافعی کے بالمقابل ویسی ہی ہے جیسی کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے مذہب کی مذہب ابوحنیفہ کے مقابلے میں، فرق صرف اتنا ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ساتھ مدون کیا گیا، جب کہ امام احمد کا مذہب، مذہب شافعی کے ساتھ مدوّن نہیں کیا گیا جس کی بنا پر اس کو الگ مذہب سمجھ لیا گیا، ورنہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع وہ کوئی جداگانہ مذہب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

البتہ تاریخی طور پر مذہب شافعی میں مجتہد مطلق، اور مجتہد فی المذہب بکثرت ہوئے ہیں۔ اسی طرح تمام مذاہب کے مقابلے میں اصولیین، متکلمین، مفسرین قرآن، شارحین حدیث، ممتاز اور بصیرت مند فقہاء مذہب شافعی میں زیادہ پیدا ہوئے۔ مذاہب کا مطالعہ و تحقیق کرنے والے شخص کے لئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ امام شافعی کے اصحاب خود بھی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو امام شافعی کے تمام مجتہدات کی تقلید کرتے تھے۔ ابن سریج تک یہی معاملہ رہا۔

واجب وہ امر ہے جس کے کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہو (اصول فقہ)

ابن شریح نے تقلید وتخریج کے قواعد کی بنیاد ڈالی، تو پھر مذہب شافعی نے اسی رخ پر اپنا سفر شروع کیا اور بعد کے فقہاء نے ابن شریح کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنے فقہی اور اجتہادی کاموں میں رہنما خطوط کے طور پر اپنے سامنے رکھا۔(۱)

یقیناً شاہ صاحب نے یہ فیصلہ مذاہب اور تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد فرمایا ہے۔ البتہ مذہب حنفی میں مجتہد منتسب کم ہونے کی وجہ شاہ صاحب نے جو حدیث سے تعلق میں کمی بتائی ہے، ممکن ہے بعض ناقدین کو اس سے اختلاف ہو، اس لئے کہ مذہب حنفی میں حفاظ حدیث کی کبھی کمی نہیں رہی، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اس کو اپنی تصنیفات وتالیفات کا موضوع نہیں بنایا کہ یہ خدمت کرنے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ اس لئے انھوں نے فن حدیث پر مکمل مہارت کے باوجود علم فقہ پر توجہ دی اور اس کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا، ورنہ تیسری صدی کے بعد بھی (جس کے بارے میں شاہ صاحب کا خیال ہے کہ اس مذہب میں اشتغال بالحدیث کی کمی کی بنا پر اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا) حنفیہ میں بڑے بڑے حفاظِ حدیث ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً حافظ ابو بشر الاولابی حافظ ابو جعفر الطحاوی، حافظ ابن ابی العوام السعدی، حافظ ابو محمد الحارثی، صاحب مسند ابی حنیفہ، حافظ عبدالباقی، حافظ ابوبکر رازی الجصاص، حافظ ابو نصر الکلابازی، حافظ ابو محمد السمرقندی، حافظ شمس الدین السروجی، حافظ قطب الدین الحلبی، حافظ علاء الدین الماردینی، حافظ جمال الدین الزیلعی، حافظ علاء الدین مغلطائی، حافظ بدرالدین العینی اور حافظ قاسم بن قطلو بغا وغیرہ۔

اسی طرح مالکیہ میں بھی بڑے بڑے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے، مثلاً حافظ حسین بن اسماعیل القاضی، حافظ الاصیلی، حافظ بن عبدالبر الاندلسی، حافظ ابو الولید الباجی، حافظ قاضی ابوبکر العربی، حافظ عبدالحق صاحب الاحکام، حافظ قاضی عیاض الیحصبی، حافظ المازری، حافظ ابن رشد الفقیہ صاحب المقدمات، اور حافظ ابوالقاسم السہیلی وغیرہ۔(۲)

البتہ ایک بڑی قابل توجہ بات علامہ مناظر احسن گیلانی نے تحریر فرمائی ہے:

"حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا اس

۱۔ الانصاف، ص ۸۴، ۸۵۔

۲۔ مقدمہ فیض الباری شرح البخاری، علامہ یوسف بنوری، ص ۱۴، ۱۵، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، ۲۰۰۰ء۔

لئے قدرتاً ان دونوں مکاتب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات و تفریعات کے ادھیڑ پن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ یہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا۔ اس لئے عموماً تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا۔" (۱)

بہرحال شاہ صاحب اجتہاد (بمعنی اجتہاد منتسب یا اجتہاد فی المذہب) کو موقوف تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فی الجملہ اجتہاد کی ضرورت ہر دور میں ہے اور یہ ضرورت اب اجتہادِ مطلق مستقل کی صورت سے پوری نہیں ہوسکتی اس لئے اب یا تو اجتہاد منتسب کے ذریعہ یہ ضرورت پوری ہوگی یا اجتہاد فی المذہب کے ذریعہ۔

مقدمۂ مصفٰی میں لکھتے ہیں:

"اجتہاد ہر زمانہ میں فرضِ کفایہ ہے۔ یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا، جو جرح و تعدیل، زباں دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے بلکہ مقصود اجتہاد منتسب ہے اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلّہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقے پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانے میں فرض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں ان میں اکثر میں انقطاع ہے، کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کرسکتا، اس لئے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کئے اور تحقیق کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔" (۲)

۱۔ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، ص ۲۳۳، اسلامک اکیڈمی لائل پور، پاکستان، ۱۹۶۵ء۔

۲۔ مقدمہ مصفٰی علی المسوّیٰ، ص ۲۹، ۳۰، مطبوعہ بیروت۔

مقدماتِ فرض و واجب کا بھی وہی حکم ہے جو فرض اور واجب کا ہے (اصول فقہ)

مسئلہ تقلید:

تقلید ائمہ کا مسئلہ بھی بڑا اختلافی رہا ہے اور ہر دور میں لوگ اس تعلق سے افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔ ایک طرف ابن حزم اور ظاہر پرست حضرات ہیں، جو تقلید کو بالکل حرام اور شرک کے مترادف سمجھتے ہیں، دوسری طرف غالی مقلدین کا گروہ ہے جو کتب فقہ کی تمام جزئیات کو وہی درجہ دیتا ہے جو قرآن و حدیث کا ہے اور اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں کے درمیان نقطہ عدل اختیار فرمایا۔ ایک طرف ابن حزم کے قول کا محل متعین کیا، دوسری طرف تقلید کا مطلب واضح کیا کہ تقلید کی حقیقت کیا ہے؟ اور لوگ ائمہ کی تقلید کیوں کرتے ہیں؟ اسی طرح تاریخی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی کہ چوتھی صدی سے قبل تک لوگ تقلید شخصی تو کرتے تھے مگر کسی ایک شخص یا ایک مذہب کی لازمی تعیین کے ساتھ نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد نبوت قریب تھا۔ ہوا و ہوس کا اتنا غلبہ نہ تھا، علماء و فقہاء بھی بآسانی میسر تھے، اس لئے ہر شخص کو اس کی اجازت تھی کہ جس سے چاہے مسئلہ دریافت کرے، لیکن بعد میں ہوا و ہوس کی کثرت کی بنا پر ہر شخص قابل اعتماد نہیں رہا اور لوگ مسائل کے استفتاء کے لئے شخصیات کے انتخاب میں خواہش نفس کو دخیل بنانے لگے۔ اس ضرورت کے تحت ''مذہبی تعیین'' پیدا ہوئی اور لوگوں کو راہِ حق و ہدایت پر مستقیم رکھنے کے لئے متعینہ طور پر کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری قرار دی گئی، گویا یہ امت کی دینی ضروریات کے لئے ایک انتظامی حکمت عملی تھی۔

غرض اس بارے میں شاہ صاحب نے جو مسلک اختیار کیا اور اس کی جو تعبیر کی وہ روحِ شریعت سے قریب تر، قرنِ اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرتِ انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے۔

شاہ صاحب تقلید کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور ان دنوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے، یا کبھی ایک سے لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے۔ اس کی نیت سلیم ہے اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے۔ یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جب کہ

سنت وہ فعل ہے جس کے کرنے کا مطالبہ غیر لازمی طور پر اس طرح ہو کہ کرنے کی تاکید ہو (اصول فقہ)

کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے، تو اگر ہم نے ان فقہاء وائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بناء پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے۔ اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں، یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے، یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے، اس بنا پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے۔ اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاسکتی ہے۔ لیکن ظنی طریقہ پر، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسولِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کہ کوئی حدیث قابل وثوق سند سے پہنچے جو اس مجتہد یا امام کے فتویٰ اور قول کے خلاف ہو اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں، اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟'' (۱)

علامہ ابن حزم جو تقلید کے خلاف ہیں، ان کے قول کا محل متعین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے اقوال و

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۵۶۔

سنت کا مصداق وہ امور ہیں جن کا ثبوت نبی کریم ﷺ یا آپ کے اصحاب سے ہو (اصول فقہ)

احوال) کا علم حاصل نہیں اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم دین کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا۔''(۱)

''اس قول کا مصداق وہ عامی مقلد ہے جو اپنے امام کے بارے میں یہ تصور رکھے کہ اس سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس کی ہر بات قطعی طور پر درست ہے، نیز اس کا عزم ہو کہ وہ اس کی تقلید کبھی ترک نہیں کرے گا چاہے اس کے خلاف کتنی ہی دلیلیں آجائیں۔

اسی طرح اس میں وہ شخص بھی آتا ہے جو اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے، یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، اس لئے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کے خلاف ہے۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا، ان قیود و شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوسکتا۔(۲)

مذاہب اربعہ کی تخصیص:

البتہ چوتھی صدی ہجری سے قبل تک مذاہب اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کی بھی تقلید کی جاتی تھی، لیکن دوسرے حضرات مجتہدین کے مذاہب گردشِ ایام کے اثر سے پوری طرح محفوظ نہ رہ سکے، اور نہ ان کے پیروکاروں کی تعداد باقی رہی، اب ان کے ہی اقوال و آراء محفوظ رہ گئے ہیں جو مذاہب اربعہ کی کتابوں میں مختلف مناسبتوں سے مذکور ہوئے ہیں۔ اس لئے چوتھی صدی ہجری کے بعد ان مذاہب اربعہ کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہا اس لئے حکمت الٰہی سے قدرتی طور پر تقلید شخصی

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۵۵۔ ۲۔ الانصاف، ص ۱۰۰، ۱۰۱۔

مستحب: وہ امر ہے کہ جس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہ ہو (اصول فقہ)

انہی چار مذاہب میں منحصر ہو کر رہ گئی، حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" میں اس پر بہت محققانہ اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار میں بڑی مصلحت ہے اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ و اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں سلفِ متقدمین پر اعتماد کیا جائے۔ تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر، علیٰ ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیش رووں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے اور نقل اسی وقت ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے، اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں، تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرقِ اجماع نہ ہو جائے۔ اس کے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں میں بھی پائی جاتی ہے، صرف، نحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگ ریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم ہوتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے، لیکن واقعتہً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال و تحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی اور مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام و خاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے۔ وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جا چکی ہو اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی گئی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں، سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔

حرام وہ فعل ہے کہ جس کے نہ کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہو (اصول فقہ)

جب ان مذاہب اربعہ کے علاوہ دیگر تمام مذاہب حقہ مٹ گئے، تو اپنی مذاہب اربعہ کی اتباع سواد اعظم کی اتباع مانی جائے گی اور ان کی اتباع سے خروج سواد اعظم سے خروج مانا جائے گا۔" (۱)

ان مذاہب کی اتباع بھی علی العموم نہیں بلکہ کسی ایک مذہب معین کی اتباع لازم ہے۔ دوسری صدی سے قبل تک اس میں توسع تھا، مگر اس کے بعد یہ توسع ختم کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اب نہ وہ ورع و احتیاط رہی، اور نہ وہ خوف خدا اور جذبۂ تحقیق حق باقی رہا۔ اگر آج اس بات کی کھلی آزادی دے دی جائے کہ جس مجتہد کا چاہو قول اختیار کر لو تو دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا، کیونکہ اکثر مجتہدین کے یہاں کچھ نہ کچھ منفرد اقوال ایسے ملتے ہیں جن کو خواہشات نفس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ:

وبعد المائین ظهر فیهم التمذهب للمجتهدین باعیانهم وقل من کان لا یعتمد علی مذهب مجتهد بعینه وکان هذا هو الواجب فی ذلک الزمان۔ (۲)

دوسری صدی ہجری کے بعد متعینہ طور پر کسی مجتہد کے مذہب کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوا اور بہت کم لوگ ایسے رہے جو کسی معین مذہب کے پابند نہ ہوں اور اس زمانے میں یہی واجب تھا۔

تقلید واجب لغیرہ ہے:

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جو چیز عہد نبوت میں واجب نہ تھی وہ بعد میں کیسے واجب ہو گئی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ واجب کی دو قسمیں ہیں، ایک واجب لعینہ، دوسرے واجب لغیرہ واجب لعینہ تو وہی چیزیں ہیں جن کو عہد رسالت میں واجب کر دیا

۱۔ ولما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة کان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم (عقد الجید، ص ۳۷۔۳۸)۔

۲۔ الانصاف، ص ۷۰۔

مکروہِ تحریمی وہ فعل ہے جس کے کرنے سے عبادت ناقص ہو جاتی ہے اور کرنے والا گناہ گار ہوتا ہے

گیا۔ اس کے بعد ان میں اضافہ نہیں ہوسکتا، لیکن واجب لغیرہ میں اضافہ ہوسکتا ہے، وہ اس طرح کہ مقصد تو ایک واجب کی ادائیگی ہوتی ہے، لیکن اگر اس واجب کی ادائیگی کا کسی زمانہ میں صرف ایک طریقہ رہ جائے تو وہ طریقہ واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً عہد رسالت میں احادیث کی حفاظت واجب تھی لیکن کتابت واجب نہ تھی، کیونکہ حفاظت حدیث کا فریضہ محض حافظہ سے بھی ادا ہوسکتا تھا۔ لیکن بعد میں جب حافظوں پر اعتماد نہ رہا، تو حفاظتِ حدیث کا کوئی طریقہ بجز کتابت کے باقی نہ رہا، اس لئے کتابت واجب ہوگئی، اسی طرح عہدِ صحابہ وتابعین میں غیر مجتہد کے لئے مطلق تقلید واجب تھی، لیکن جب تقلید مطلق کا راستہ پُرخطر ہوگیا تو اب صرف تقلید شخصی ہی کو واجب قرار دیا گیا۔(۱)

اس کلیہ کے مطابق اگر کہیں مذہب حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کے علماء وفقہاء نہ ہوں تو مذہب حنفی ہی کی تقلید لازم ہے۔ اس سے خروج جائز نہیں، اس لئے کہ مذہب حنفی سے خروج اسلام سے خروج کا سبب بن جائے گا۔(۲)

غرض بحالاتِ موجودہ عامی شخص کے لئے شریعت پر عمل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان هذه المذاهب الاربعة المدوّنة المحرّرة قد اجتمعت الامة اى من يعتد منها على جواز تقليدها الى يومنا هذا وفى ذلك من المصالح مالا يخفى لاسيما فى هذه الايام التى قصرت فيها الهمم جد او أشربت النفوس الهوىٰ و أعجب كل ذى رأى برائه۔(۳)

۱۔ الانصاف، ص ۷۷، ۷۸۔

۲۔ **وعلى هذا ينبغى ان القياس وجوب التقليد لامام بعينه، فانه قد يكون واجباً وقد لا يكون واجباً، فاذا كان انسان جاهل فى بلاد الهند او فى بلادما وراء النهر وليس هناك عالم شافعى ولا مالكى ولا حنبلى ولا كتاب من كتب هذه المذاهب وجب عليه ان يقلد المذهب ابى حنيفة ويحرم عليه ان يخرج من مذهبه لانه حينئذ لخلع ويبقى سدًى مهملاً۔** (الانصاف، ص ۷۹)۔

۳۔ بعض علماء نے طبری کو شافعیہ سے خارج قرار دیا ہے، مگر شاہ صاحب کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک طبری کا شمار شافعیہ ہی میں ہونا چاہئے۔

مکروہ تنزیہی وہ فعل ہے کہ جس کا کرنا شریعت میں پسند نہ کیا گیا ہو اور اس سے بچنا بھی ثواب ہو

مذاہب اربعہ جو تحریری صورت میں موجود ہیں، پوری امت یا کم از کم امت کے قابل لحاظ طبقہ نے آج تک ان کی تقلید کے جواز پر اتفاق کیا ہے۔ ان میں جو مصالح و اسرار ہیں۔ بالخصوص موجودہ حالات میں جبکہ ہمتیں کوتاہ ہیں، ہوا پرستی کا دور دورہ ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر نازاں ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔

اس طرح شاہ صاحب نے تقلید کے تمام گوشوں پر محققانہ کلام کیا ہے اور اس پر وارد ہونے والے تمام اشکالات کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاہ صاحب غیر مقلد تھے۔ حیرت ہے تقلید کی اتنی مدلل و محقق وکالت کرنے والا شخص غیر مقلد کیوں قرار پا سکتا ہے؟ صحیح ہے کہ شاہ صاحب نے بعض چیزوں میں مذہب حنفی سے اختلاف کیا ہے، لیکن جب امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور عباس الاصم اپنے مذہب سے بعض اختلافات کے باوجود شاہ صاحب کے نزدیک دائرہ تقلید سے خارج نہیں ہیں، بلکہ ابن جریر طبری اپنے شدید اختلافات کے باوجود مذہب شافعی سے خارج نہیں ہیں۔(۱) تو پھر شاہ صاحب اپنے بعض اختلافات کی بنا پر مذہب حنفی سے خارج کیسے قرار پا سکتے ہیں؟

پھر اگر شاہ صاحب کے نزدیک تقلید اور بالخصوص ائمہ اربعہ کی تخصیص اتنی ہی غیر ضروری چیز ہوتی تو ''الانصاف'' میں مستقل یہ باب قائم نہ فرماتے:

باب تاکید الاخذ بھذہ المذاھب الاربعة والتشدید فی ترکھا والخروج عنھا۔

یعنی مذاہب اربعہ کی تقلید ضروری ہے اور ان سے خروج سخت گناہ ہے۔

اس باب کے تحت شاہ صاحب نے مختلف وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ ان مذاہب اربعہ کی تقلید کیوں ضروری ہے؟ ارباب نظر کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ (باقی)

مجلّہ کے لئے فقہی مقالات ارسال فرما کر تعاون فرمائیے

۱۔ الانصاف، ص ۷۶۔

مباح وہ کام ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہو (اصول فقہ)